علوم شرعیہ میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تجدیدی مساعی

محمد انس حسان*

Abstract

Reconstructive Efforts of *Shāh Walī Allah Dehlavī* in the *Sharī'ah* Sciences

Shāh Walī Allah Dehlavī Muhaddith Dehlavī (1703-1762) was an eminent scholar, philosopher and thinker of Sub-continent. His religious thoughts and services were immense and enormous. He believed to comprehend to demands of modern world and to shape Islamic teachings in accordance with it, so he thought *Ijtihād* as the need of the modern time. He kept casuistical and prophetic vision to find new venues in religion in the changing world. This is the most significant aspect of his thoughts which inspires me and it is the topic of my present article.

Keywords: *Shāh Walī Allah Dehlavī*; *Sharī'ah* Sciences; Reconstructive Efforts

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ بمطابق ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء چہار شنبہ کے دن طلوع آفتاب کے وقت شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی فخر النساء کے بطن سے پیدا ہوئے۔[۱] آپ کا نام قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نام پر "قطب الدین" رکھا گیا جبکہ تاریخی نام "عظیم الدین" ہے۔[۲] تاہم "ولی اللہ" کے نام سے آپ کو شہرت ملی۔ آپ کے والد شاہ عبد الرحیم دہلویؒ (۱۶۴۴ء-۱۷۱۸ء) بہت بڑے عالم دین اور صوفی تھے۔ انہوں نے "فتاویٰ عالمگیری" کی تدوین میں حصہ لیا تھا۔ شاہ صاحبؒ کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے تیس واسطوں سے حضرت فاروق اعظمؓ تک اور والدہ کی طرف سے امام موسیٰ کاظمؒ تک پہنچتا ہے۔ ہندوستان کے اس وقت کے رواج کے مطابق شاہ صاحبؒ نے پندرہویں سال میں تعلیم سے فراغت حاصل کر لی۔ اسی دوران آپ کی شادی آپ کے ماموں کی بیٹی اور شیخ محمد عاشق پھلتی (۱۶۹۹ء-۱۷۷۴ء) کی بہن "امۃ الرحیم" سے ہوئی، تاہم مختصر عرصہ ہی میں اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادے شیخ محمد[۳] جبکہ ایک صاحبزادی امۃ العزیز[۴] تھیں۔ شاہ صاحبؒ نے دوسرا عقد ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء میں سونی پت میں "بی بی ارادت" سے کیا اور ان کے بطن سے نو اولادیں ہوئیں جن میں سے درج ذیل چار فرزندان گرامی کو خصوصی شہرت نصیب ہوئی۔ شاہ عبد العزیز (۱۷۴۵ء- ۱۸۲۲ء)، شاہ رفیع الدین (۱۷۴۹ء-۱۸۱۸ء)، شاہ عبد القادر (۱۷۵۲ء-۱۸۱۵ء) اور شاہ عبد الغنی (۱۷۵۵ء-۱۷۸۸ء)۔

شاہ صاحبؒ نے تحصیلِ علم کے بعد کم و بیش بارہ سال تک اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں درس دیا، جن میں سے تین سال ایسے ہیں جن میں وہ اپنے والد کی زندگی میں درس دیتے رہے۔ ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء کے آخر میں حج سے مشرف ہوئے اور زیارت کے ساتھ ساتھ شیوخِ حدیث سے خوب کسبِ فیض کیا۔ شاہ صاحبؒ کی عمر اس وقت تیس سال تھی۔[۵] ۱۱۴۴ھ / ۱۷۳۱ء میں آپ نے دوبارہ مناسک حج ادا کیے اور ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۲ء کے اوائل میں واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔[۶] اسی سفر میں آپ کو ایک روحانی مکاشفہ کے ذریعہ بتایا گیا کہ وہ "قائم الزماں" ہیں[۷] اور بر عظیم کے معروضی حالات

* پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اسلامیات، یونیورسٹی آف سرگودھا

میں انہیں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ چنانچہ اس سفر سے واپس آکر شاہ صاحبؒ نے برعظیم کے حالات کا عمیق مشاہدہ کرنے کے بعد مختلف شعبوں میں زوال کے اسباب اور ان کے حل کے لیے ایک واضح اور مکمل نظامِ فکر کو اپنی متعدد کتب میں مرتب کیا۔ ان کے بعد اس فکر کو ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے عام فہم انداز میں عوامی سطح پر متعارف کروایا۔

بناء بریں شاہ صاحبؒ مدرسہ رحیمیہ کی تدریسی ذمہ داریاں اپنے فرزندِ ارجمند شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کو منتقل کرکے خود تصنیفی مصروفیات میں مشغول ہوگئے۔ جن کی ترتیب و تسوید کا کام ان کے ماموں زاد اور دوست شیخ محمد عاشق پھلتیؒ نے سرانجام دیا۔ مولانا نسیم احمد فریدی کے مطابق شاہ صاحبؒ کی کتب کی تعداد اکسٹھ کے قریب ہے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے غلط طور پر منسوب آٹھ کتب کا ذکر بھی کیا ہے۔[۸] لیکن ڈاکٹر محمد مظہر بقاؒ کے مطابق آپؒ کی تصنیف کردہ کتب کی تعداد تہتر ہے۔[۹] البتہ آٹھ غلط طور پر منسوب کتب کا وہ بھی اعتراف کرتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے سب سے پہلے اردو سوانح نگار مولانا رحیم بخشؒ کے مطابق شاہ صاحبؒ کی کتب کی تعداد تو سو سے بھی متجاوز ہیں تاہم انہوں نے شاہ صاحبؒ کی پینتالیس کتب کا ذکر کیا ہے۔[۱۰] محض اکسٹھ سالہ زندگی میں سے اٹھائیس سالہ تصنیفی زندگی میں اتنی علمی کتب ورسائل کی تصنیف ایک محیر العقول کام ہے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

آپؒ کے مرض الموت کا آغاز بڈھانہ (ضلع مظفر نگر) سے ہوا۔ یکم جولائی ۱۷۶۲ء کو آپ علاج کے لیے دہلی تشریف لائے اور اپنے مرید وشاگرد بابا فضل اللہ کشمیری کے مکان پر قیام کیا۔ ۲۹ محرم ۱۱۷۴ھ بمطابق ۲۰ اگست ۱۷۶۲ء جمعہ کے دن ظہر کے وقت آپ کا انتقال ہوا۔ مہندیاں کے قبرستان میں اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ "او بود امام اعظم دین" سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

شاہ صاحبؒ کے تجدیدی عمل کا دائرہ کار بہت وسیع، متنوع اور ہمہ گیر ہے۔ اس کا تعلق عقائد واخلاق، تہذیب و معاشرت، سیاست ومعیشت اور تعلیم وتدریس سبھی سے ہے۔ انہوں نے ان تمام چیزوں کو اپنے غور وفکر اور مطالعہ ومشاہدہ کا موضوع بنایا ہے اور اسے سلف صالح کے مزاج وروش کے مطابق، دین خالص کے میزان پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس پورے عمل میں شاہ صاحبؒ کا طریقہ مجتہدانہ، مصلحانہ اور بصیرت آمیز ہے۔ وہ ان میں سے کسی بھی چیز کے کسی بھی پہلو کو تقلید وروایت پسندی کی بنیاد پر اختیار کرنے اور اسے انفرادی یا اجتماعی رویے کی اساس بنانے کے لیے تیار نظر نہیں آتے کہ ایک مجدد کی شان یہی ہے۔ اسی طرح شاہ صاحبؒ کا خاص ذوق ہے کہ بظاہر متعارض اور متضاد نظر آنے والے بعض مسائل میں اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ رفع اختلاف اور فن تطبیق کے اس عمل نے انہیں دیگر مفکرین اور مجددین سے ممتاز کردیا ہے۔

مجموعی طور پر شاہ صاحبؒ کے عمل تجدید کے دو رخ ہیں:

۱- پہلے کا تعلق علومِ شرعیہ کی تجدید واحیاء سے ہے جسے وہ خلافت باطنی[۱۱] سے موسوم کرتے ہیں۔

۲- دوسرے کا تعلق استحکام مرکز حکومت سے ہے جسے وہ خلافت ظاہری[۱۲] کا نام دیتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے علوم وفنون میں جو سب سے اہم کارنامہ سرانجام دیا وہ علومِ شرعیہ کی تجدید واحیاء سے متعلق ہے۔ انہوں نے

قرآن کریم، احادیث مبارکہ، فقہ اسلامی اور تصوف کے حوالے سے ایسا قابلِ مطالعہ فکری سرمایہ چھوڑا ہے کہ ان میں سے ہر ایک موضوع الگ سے تفصیلی کام کا متقاضی ہے۔ اگرچہ شاہ صاحبؒ کے عمل تجدید کے مذکورہ بالا رخوں کے بھی کئی پہلو ہیں لیکن ہمارے پیش نظر شاہ صاحبؒ کے عمل تجدید کا پہلا رخ ہے جس پر ہم اپنی معروضات پیش کریں گے۔

علم قرآن میں تجدیدی مساعی

شاہ صاحبؒ اپنے گہرے مطالعہ اور عمیق مشاہدہ سے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ امت کے زوال کا سبب قرآن کریم سے دوری ہے۔ ان کے دور میں خواص کی زبان عربی اور عوام کی زبان فارسی تھی۔[۱۳] جبکہ علماء قرآن فہمی کو عوام میں منتقل نہیں کر پا رہے تھے۔ اس کا ذکر شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب التفہیمات الالٰہیہ[۱۴] میں بھی کیا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ نے تعلیم فہم قرآن کی ایک تحریک بپا کی۔ اس ضمن میں آپ نے قرآن کے اعجاز کو اسلوبِ ادب اور نظم قرآن سے نکال کر اس کے معانی اور مطالب تک وسعت دی اور قرآن کی جامعیت کی نئی تعبیر متعارف کرائی۔ انہوں نے قرآن کریم کا فارسی ترجمہ فتح الرحمن[۱۵] کے نام سے کیا۔ آج کے دور میں اس وقیع اور مشکل کام کی نوعیت کو سمجھنا اتنا آسان نہیں کیونکہ اس کام کی وجہ سے شاہ صاحبؒ کو اپنے دور کے علماء اور دیگر لوگوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ حیات ولی[۱۶] کے مصنف نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس عمل کی وجہ سے انہیں قتل کر دیئے جانے کا امکان تھا۔[۱۷] مگر یہ بات تاریخی اعتبار سے درست نہیں چنانچہ مولانا سعود عالم قاسمی نے اس حوالے سے کافی تفصیلات فراہم کی ہیں۔[۱۸] نیز مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ء-۱۹۴۴ء) نے بھی اسے چند شر پسندوں کی شرارت قرار دیا ہے۔[۱۹]

شاہ صاحبؒ نے اس ترجمہ کا آغاز ۱۱۴۱ھ / ۱۷۳۰ء میں کر دیا تھا۔ تاہم کچھ عرصہ بعد فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے حجاز تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر مظہر بقا اور مولانا سعود عالم قاسمی کے مطابق حجاز جانے سے پہلے تک وہ سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران کا ترجمہ کر چکے تھے۔[۲۰] ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۲ء میں واپسی کے بعد ترجمہ میں جزوی تعطل آیا لیکن آٹھ سال کے عرصہ میں یعنی ۱۱۵۱ھ / ۱۷۴۰ء میں یہ ترجمہ مکمل ہو چکا تھا۔ البتہ اس کی پہلی اشاعت ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۵ء میں ہوئی۔ اس ترجمہ کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ: "یہ زمانہ جس میں ہم ہیں اور یہ ملک جس میں ہم بود و باش رکھتے ہیں، اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی تقاضا کرتی ہے کہ روزمرہ کی متداول اور سلیس فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا جائے"۔[۲۱]

اگرچہ شاہ صاحبؒ کا یہ ترجمہ قرآن برصغیر میں پہلا ترجمہ نہیں تھا[۲۲] لیکن یہ ترجمہ بعض ایسی خصوصیات کا حامل تھا جو دیگر تراجم میں موجود نہ تھیں۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ کے مطابق یہ ترجمہ دوسرے ترجموں سے متعدد وجوہ سے ممتاز ہے:

۱- ایک یہ کہ قرآن کی عبارت کا اسی مقدار کے مطابق متعارف فارسی زبان میں اظہار مراد اور لطافت تعبیر کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے اور دوسرے تراجم میں عبارت کی طوالت، تعبیر کی رکاکت اور مفہوم کے سمجھنے میں جو دقت پیش آتی ہے حتی الامکان اس سے پرہیز کیا گیا ہے۔

۲- دوسرے یہ کہ سارے تراجم دو حال سے خالی نہیں ہیں۔ یا تو قرآن سے متعلق قصوں کو مطلقاً چھوڑ دیا گیا ہے یا ان تمام کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس ترجمہ میں درمیانی راہ اختیار کی گئی ہے۔

۳- تیسرے یہ کہ مختلف توجیہات میں عربی کے اعتبار سے زیادہ مضبوط علم حدیث اور علم فقہ کے اعتبار سے زیادہ درست اور صرفی لحاظ سے کم الفاظ کی توجیہ کو اختیار کیا گیا ہے۔

۴- چوتھے یہ کہ قدیم تراجم کی دو صورتیں ہیں یا تو ترجمہ تحت اللفظ ہے یا ترجمہ حاصل المعنی۔ان دونوں میں بہت سی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں مگر یہ ترجمہ دونوں قسم کے ترجمہ کو جامع ہے۔[۲۳]

شاہ صاحبؒ کا یہ ترجمہ برصغیر میں عوامی سطح پر قرآن فہمی کو عام کرنے کی پہلی مستقل کاوش تھی۔چنانچہ شاہ صاحبؒ کے پیش نظر محض یہ خواہش تھی کہ قرآن مجید کے گرد لپٹے خود ساختہ لحاف ختم کر دیے جائیں تاکہ ایک عام آدمی بھی اس سے استفادہ کر سکے۔بعد ازاں شاہ صاحبؒ کے اس "رجوع الی القرآن" کے نظریے کو ان کی اولاد نے آگے بڑھایا۔چنانچہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے فتح العزیز[۲۴] کے نام سے نامکمل تفسیر تحریر کی اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے موضح قرآن[۲۵] کے نام سے قرآن مجید کے پہلے اردو ترجمہ مع تفسیر کی بنیاد رکھی جس سے عوام کے ایک بڑے طبقے کو قرآنی تعلیمات تک براہِ راست رسائی حاصل ہو گئی۔شاہ صاحبؒ نے اپنے فکر کے پھیلاؤ اور وسعت کے لیے قرآن فہمی پر زور دیا۔انہوں نے قرآنِ کریم کے اعجاز کے بلاغی پہلوؤں سے ہٹ کر اس کے اعجاز کو اس کے بتائے ہوئے نظامِ حیات میں متعین فرمایا۔[۲۶] انہوں نے ترجمہ کے ساتھ مختصر حواشی بھی تحریر فرمائے۔ بقول مولانا عبیداللہ سندھیؒ شاہ صاحبؒ کے فلسفہ کو سمجھنے کے لیے ان کے ترجمہ قرآن کے حواشی سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔[۲۷]

شاہ صاحبؒ نے قرآن کریم کی تفسیر کے قدیم اصولوں پر نظر ڈالتے ہوئے ان اصولوں کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور اس سلسلے میں الفوز الکبیر فی اصول التفسیر[۲۸] تحریر کی۔اگرچہ اس کتاب کے سن تالیف کے حوالے سے شاہ صاحبؒ نے خود کچھ نہیں لکھا لیکن اس کی بعض عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فتح الرحمن اور تاویل الاحادیث کے بعد شائع ہوئی تھی۔[۲۹] چونکہ ان دونوں کتب کے بارے میں صراحت موجود ہے کہ یہ ۱۱۵۱ھ-۱۷۴۰ء میں تکمیل پذیر ہوئی تھیں اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ان کے بعد لکھی گئی ہو گی۔

شاہ صاحبؒ نے فہم قرآن میں دشواریوں کے اسباب اور ان کا حل اتنے دلنشین اور مرتب انداز میں پیش کیا ہے کہ فہم قرآن کے دروازے کھلتے محسوس ہوتے ہیں۔اسی طرح شاہ صاحبؒ نے قرآن مجید کی منسوخ آیات کے حوالے سے علمائے متقدمین سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کی ہے۔چنانچہ آپؒ کی رائے میں قرآن مجید کی محض پانچ آیات ہی منسوخ ہیں۔[۳۰] اسی طرح شاہ صاحبؒ نے قرآن مجید کے علوم کو علوم پنجگانہ کے تناظر میں پیش کیا ہے۔شاہ صاحبؒ کے مطابق قرآن مجید درج ذیل پانچ علوم سے بحث کرتا ہے: ۱- علم الاحکام ۲- علم المخاصمہ ۳- علم تذکیر بآلاءاللہ ۴- علم تذکیر بایام اللہ ۵- علم تذکیر بالموت حقیقت تو یہ ہے کہ علوم قرآن کی تخصیص کے حوالے سے آج تک مسلم دنیا اس سے آگے نہیں بڑھ پائی ہے اور اہل نظر ہی اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے فتح الخبیر[۳۱]،المقدمہ فی قوانین ترجمہ[۳۲] اور تاویل الاحادیث[۳۳] کے ذیل میں اپنے دور کی علمی روایات اور قرآنی رجحانات سے ہٹ کر نئی علمی روایات کو جنم دیا۔شاہ صاحبؒ کے نزدیک صحیح علم وہ ہے جو حال کے تقاضے اور ضروریات پورے کرے اور یہ تقاضے قرآن ہی پورے کرتا ہے۔[۳۴] ان کی حکمت کا خاص جوہر یہ ہے کہ وہ وحی اور عقل میں باہمی تضاد

کا انکار کرتے ہیں۔[۳۵] گویا وہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ حکمت کو عقل کا وصف قرار دیتے ہوئے[۳۶] اسے قرآن فہمی کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے اس اندازِ فکر نے انہیں حقیقت پسندانہ اسلامی مفکر کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ اس حقیقت پسندی کا سبب شاہ صاحبؒ کے دور کے لوگوں میں قرآن فہمی کے حوالے سے وہ سطحیت اور رکاکت ہے جس نے انہیں قرآن سے بہت دور کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں بلکہ یہ کتاب انسانی زندگی سے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس لیے اس کی تعلیمات کو سمجھنا اور اس سے اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں رہنمائی لینا بہت ضروری ہے۔

شاہ صاحبؒ کے قرآنی فکر کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱- قرآنِ عظیم ایک انقلاب آفریں نظام کی دعوت دیتا ہے۔ یہ انقلاب آفریں نظام بین الاقوامی اور ساری انسانیت پر شامل ہے۔

۲- قرآن کی تعلیمات کے اثر سے مسلمانوں میں جو اجتماعی تحریک عالمِ وجود میں آئی وہ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے شروع ہو کر حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت تک جاری رہی۔

۳- قرآنِ کریم کا تمام ادیان پر غالب ہونا خلافت راشدہ کے دور میں مکمل ہو گیا ہے۔ اس لیے کسی نبی یا ولی کا انتظار غلط ہے۔

۴- قرآنِ کریم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ قیصر وکسریٰ کے نظام کو توڑ کر انسانیت پر مبنی نظام لایا جائے۔

۵- قرآن کریم ایک انقلابی کتاب ہے جو انسانیت کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے۔[۳۷]

شاہ صاحبؒ کی قرآن فہمی کی تحریک کے تین پہلو ایسے ہیں جو ابھر کر سامنے آتے ہیں:

- مہلک رسوم ورواج اور مشرکانہ عقائد وخیالات کی عام وبا کے لیے قرآن کو موثر علاج کی حیثیت سے متعارف کروانا۔
- قرآن اور شریعت کی اساس اور سرچشمہ اول کی حیثیت سے قرآن کو پیش کرنا۔
- اس بات کا شعور پیدا کرنا کہ جب لوگ قرآن کی طرف رجوع کریں گے تو ان کی ذہنی اور فکری سطح بھی بلند ہوتی چلی جائے گی۔

عبد القادر جعفری نے بالکل بجا لکھا ہے کہ: "فتح الرحمن او رالفوز الکبیر دعوت الی القرآن اور تدبر قرآن کی صلاحیت پیدا کرنے اور امت کی اصلاح کا جذبہ پیدا کرنے کے سلسلے میں شاہ صاحب کی ایک تجدیدی اور انقلابی خدمت ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کو اجتہادی نہ کہہ کر اگر الہامی کہا جائے تو غالباً نہ کوئی بیجا بات ہو گی اور نہ مبالغہ"۔[۳۸]

شاہ صاحبؒ کی تحریکِ قرآن فہمی کے نتائج واثرات کے حوالے سے پروفیسر بدرالدین لکھتے ہیں کہ: "تاریخ شاہد ہے کہ شاہ صاحب کی اس تحریک سے آئندہ قرآن کی اشاعت کا رجحان بڑھا۔ ترجمہ اور تفسیر کی طرف لوگ راغب ہوئے اور امت قرآن خوانی کے مرحلہ سے نکل کر قرآن فہمی کے دور میں داخل ہوئی۔ پھر یہ اثرات بعد کے ادوار میں بھی واضح طور پر محسوس کیے گئے اور آج تک موجود ہیں"۔[۳۹]

علم حدیث میں تجدیدی مساعی

شاہ صاحبؒ کو حدیث کے ذکر میں جو سرشاری کی کیفیت اور ائمہ حدیث کی ذات کے ساتھ جو گہری عقیدت تھی اس کا کچھ نمونہ اس مکتوب میں دیکھا جا سکتا ہے جو انہوں نے امام بخاریؒ کے مناقب میں اپنے ایک مسترشد کو لکھا ہے۔[۴۰] اس میں کوئی شک

نہیں کہ علم حدیث کی جو خدمت شاہ ولی اللہؒ نے کی ہے اس کے لیے بر عظیم آپ کا ہمیشہ مرہون منت رہے گا۔ پروفیسر غلام حسین جلبانی کے مطابق شاہ صاحبؒ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان میں ایک مستقل دارالحدیث قائم کیا۔[۴۱] شاہ صاحبؒ نے فن حدیث کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے: ۱- فقہ السنۃ ۲- فنِ روایت حدیث ۳- علمِ اسرارِ دین ۴- فنِ غریب الحدیث شاہ صاحبؒ کا ماننا ہے کہ فنِ حدیث میں "علم اسرار دین" سب سے زیادہ دقیق مگر مفید ترین فن ہے، جس میں احکامِ شرعیہ کی حکمتوں اور علتوں پر بحث کی جاتی ہے[۴۲] اور اسی کو شاہ صاحبؒ نے اپنی فکر کا موضوع بنایا ہے۔ شاہ صاحبؒ کو "علم اسرار دین" سے خصوصی مناسبت تھی اور اس فن میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ حدیث و فقہ کے قریباً تمام ابواب میں جن حقائق اور اسرار و رموز کو انہوں نے بے نقاب کیا اس کی مثال اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اگرچہ "علم اسرارِ دین" کے حوالے سے شاہ صاحبؒ کا کام ان کی بہت سی کتب میں بکھرا پڑا ہے مگر ان کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ"[۴۳] ان کے اس ذوق کا عمدہ شاہکار ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ الٰہیات اسلامیہ کو عقل اور علمِ جدید کے جس میزان پر پرکھنے کا رجحان بیسویں صدی میں شروع ہوا تھا اس پر عملی کام شاہ صاحبؒ اپنی اس کتاب میں اٹھارویں صدی میں کر چکے تھے جبکہ ابھی عقلیت کے رجحانات کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ سے وہ ایسے مسائل اور نتائج اخذ کرتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ وہ قرآنِ کریم کی طرح احادیثِ نبویہ پر غور و فکر کرنے اور اس کی بنیاد پر سماج کی تشکیل کے حوالے سے ایک مکمل ضابطہ اخلاق کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ قرآن و احادیث سے اجتہاد کے عمل کو آسان بنانے کا ذوق انہیں اپنے والد شاہ عبدالرحیم دہلویؒ سے ملا تھا۔ انہوں نے اپنے دور کے علماء کو بھی افراط و تفریط اور دیگر علوم میں انہماک کی بجائے احادیثِ صریحہ کی روشنی میں اپنے ذوق کی تشکیل کی دعوت دی ہے تاکہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۵۵۱ء-۱۶۴۲ء) کے بعد اس دم توڑتی روایت کو زندہ کیا جاسکے۔

حدیث کا وہ ذوق جو انہیں اپنے والد اور قابل قدر اساتذہ سے ملا تھا قیامِ حرمین میں اسے خوب جِلا ملی۔ اس دوران آپ نے متعدد شیوخ سے احادیث کی سند بھی حاصل کی۔ اگرچہ حرمین جانے سے قبل بھی آپ ایک بڑے عالم کے طور پر جانے جاتے تھے مگر علمِ حدیث میں جو تبحر اور رسوخ آپ نے وہاں سے پایا بقول شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اب ان کی حالت پہلے سے بالکل تبدیل ہو گئی تھی اور اس کا اثر ان کے شاگرد اور مریدین واضح طور پر محسوس کرتے تھے۔[۴۴] قیام حرمین ہی کے دوران انہیں ایک باطنی مشاہدے میں اس بات کا بھی یقین حاصل ہو گیا کہ ملت کے مستقبل کو خطرات سے بچانے کے لیے انہیں اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔

محدثین کرام کی احادیث کے ذخیرہ کے حوالہ سے دو رائے پائی جاتی ہیں:

أ- ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ احادیث جمع کی جائیں۔

ب- دوسری جماعت کی رائے یہ ہے کہ احادیث صحیحہ کا ذخیرہ بہت کم ہے مگر جو ہے وہ دین کے استنباط کے لیے کافی ہے۔

شاہ صاحبؒ کا تعلق اس دوسری جماعت سے ہے۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک آج بھی معتدبہ مشق کرنے کے بعد ائمہ محدثین کی مرویات کی تحقیق کرنے کی قابلیت پیدا کی جاسکتی ہے اور علمِ حدیث کا ایک طالب علم اسناد کی آزادانہ تحقیق کر کے ایک حدیث کے متعلق وہی حکم لگا سکتا ہے جو امام ترمذیؒ نے ہر ایک متن اور سند پر اپنی کتاب جامع ترمذی میں لگایا ہے۔[۴۵] اسی طرح انہوں

نے بخاری شریف کے ابواب مرتب کر کے[۴۶] اس بات کا تاثر دیا ہے کہ آج بھی محدث ان ابواب کو اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ترتیب دے سکتا ہے۔ مولانا سندھیؒ کے مطابق حدیث کو سمجھنے میں زیادہ تر ذہنی اختلال اس وجہ سے ہوتا ہے کہ فن حدیث میں محض تقلید سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے مسلک کی ترجمانی کے لیے طلباء پہلے فقہ کے ذریعے دلائل یاد کرتے ہیں جس سے جمود پیدا ہوتا ہے۔ تاہم شاہ صاحبؒ کا نقطۂ نظر اس حوالے سے یہ تھا کہ فقہ سے پہلے طلباء میں حدیث کا اعلیٰ ذوق پیدا کیا جائے۔ شاہ صاحبؒ نے اس مرض کے ازالہ کے لیے نصاب تیار کیا اور اس کے مطابق تعلیم بھی دینی شروع کر دی تھی۔[۴۷]

شاہ صاحبؒ نے علماء کی عام روش سے ہٹ کر صحیح بخاری کے مقابلے میں مؤطا امام مالک کو زیادہ اہمیت دی۔ شاہ صاحبؒ تحریر کرتے ہیں کہ:

> کسی کتاب کی فضیلت دوسری کتاب پر یا تو مصنف کی فضیلت کی وجہ سے ہوتی ہے یا اس کتاب میں صحت کا جو التزام کیا گیا ہے اس کی وجہ سے ہوتی ہے، یا اس کی حدیث کی شہرت کی وجہ سے ہوتی ہے یا جمہور علماء اسلام میں اس کی مقبولیت کی وجہ سے ہوتی ہے یا حسن ترتیب اور تمام اہم مقاصد پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور یہ تمام جہات موطأ میں موجود ہیں۔ اس لیے یہ کتاب (کلام اللہ کے بعد) زمین پر موجود تمام کتابوں سے زیادہ افضل ہے۔[۴۸]

وہ حدیث کی دیگر کتب کے مطالعہ سے قبل اس کو بطور تمہید اور بنیادی اساس کے پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کتاب کو وہ اپنے نصاب میں قرآن کے بعد اولین ترجیح دیتے ہیں اور اس ترجیح کے درج ذیل اسباب بتاتے ہیں:

۱- موطاء امام مالک میں جو راوی ہیں وہ ایک دو سے زیادہ نہیں۔ اس لیے ان راویوں کی تنقید اور روایات کے اسانید کی تصحیح بہت آسان ہے۔

۲- امام شافعی اور امام محمد دونوں امام مالک کے شاگرد ہیں۔ ان دونوں اماموں نے باوجود اس کے کہ امام مالک کے استنباط کی بعض جگہ مخالفت کی ہے مگر ان کی جملہ روایات کو باوثوق سمجھتے ہیں۔

۳- اس کتاب کے مرتب تبع تابعین میں سے ہیں اور یہ وہ فضیلت ہے جو اور کسی کتاب کو حاصل نہیں۔

۴- امام مالک کا تعلق دیگر محدثین کے برخلاف مدینہ طیبہ سے ہے، جو نبی کریم ﷺ کی فکر کا عملی نمونہ تھا۔ تمام عالم اسلام سے لوگ اخذ حدیث کے لیے مدینہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔

۵- موطأ میں کوئی ایسی مرسل روایت نہیں ہے جس کی تائید مرفوع روایت سے نہ ہوتی ہو۔

۶- امام مالک نے فقہ کی بنیاد احادیث پر رکھی ہے۔[۴۹]

شاہ صاحبؒ نے واضح کیا ہے کہ اگر مؤطا امام مالک کو اساسی کتاب کی حیثیت سے فن حدیث کے نصاب میں شامل کر لیا جائے تو اس سے بہت سے فقہی اشکالات دور ہو سکتے ہیں اور احادیث و فقہ میں باہمی تطبیق پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا یہ بیان بڑا پر معنی ہے کہ مؤطأ میں وہ تمام مشکل حدیثیں نہیں پائی جاتیں جن کا سمجھنا کالج کے طلبہ (جدید تعلیم یافتہ طبقہ) کے لیے مشکل ہے۔[۵۰] انہوں نے اپنے فکر کی وضاحت کے لیے اس کتاب کی دو شروحات بھی لکھیں ہیں۔

عربی شرح کا نام "المسویٰ "[۵۱] اور فارسی کا "المصفیٰ "[۵۲] ہے۔

فہم حدیث میں شاہ صاحبؒ کو بڑا بلند مقام حاصل تھا۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱- حدیث کی کتب میں ایمان کے ابواب میں مباحث کا ایک طومار ہے۔ یعنی ایمان تصدیق قلبی، اقرار لسانی اور نیک اعمال کا نام ہے۔ لیکن شاہ صاحب کے نزدیک ایمان کی دو اقسام ہیں۔ پہلی قسم انقیادی ہے، اگر یہ بھی کسی شخص میں ہو گا تو دنیاوی اعتبار سے اسے مومن قرار دینے میں کوئی تکلف نہیں۔ جبکہ دوسری قسم حقیقی ہے جس میں اعمال کا بھی بھرپور اہتمام ہوتا ہے۔[۵۳] اس مختصر سی تشریح نے اس بحث کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔

۲- حدیث کی کتب میں ایک حدیث ملتی ہے کہ "حیاء ایمان کا شعبہ ہے"۔[۵۴] اس پر یہ اعتراض ہے کہ حیاء کبھی کفر بدوش افراد میں بھی موجود ہوتی ہے جبکہ بعض مؤمن اس دولت سے تہی دامن نظر آتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے حیاء کا اولین تقاضہ معصیت سے حفاظت قرار دیا ہے اور چونکہ ایمان بھی یہی کام کرتا ہے اس لیے حیاء کو مجازاً ایمان قرار دیا ہے۔[۵۵]

۳- خطبہ حجۃ الوداع میں نبی کریم ﷺ نے انسانی جان، مال اور عزت وآبرو کی حرمت کا درس دیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ حرمت سے کیا مراد ہے؟ آیا وہی معروف حرمت جو حلت کے مقابل ہے یا وہ اہانت کے مقابلے میں استعمال ہوتی ہے؟ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اگر حرمت بمقابلہ حلت لی جائے تو مفہوم ان برائیوں کا ارتکاب ہو گا جنہیں اس خاص دن میں عوام وخواص بھی بدتر سمجھتے ہیں اور اگر حرمت اہانت کے مقابلے میں ہے تو کوئی دوسرے کی توہین کا مرتکب نہ ہو۔[۵۶]

۴- امام بخاری نے ایک عنوان قائم کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک بات کو بار بار فرماتے تھے۔ اس کے ذیل میں حدیث ہے کہ جب آپ ﷺ مجلس میں تشریف لاتے تو تین بار سلام کرتے۔ اس کو دیگر علماء نے سلام استیذان قرار دیا ہے۔ لیکن شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ پہلا سلام سامنے والوں کے لیے، دوسرا دائیں جانب میں اور تیسرا بائیں جانب کے شرکاء کے لیے ہے۔[۵۷]

علم فقہ میں تجدیدی مساعی

شاہ صاحبؒ نے اپنے فکر اور فلسفے میں فقہی مباحث کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے فلسفے میں فقہ واصول فقہ کی تفہیم اس لیے قدرے آسان ہو جاتی ہے کہ وہ احکام کو اپنے مقاصد ومصالح کے دائرے میں مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک فقہی مسائل کے استخراج میں مقاصد ومصالح کی رعایت نہایت ضروری ہے۔ فقاہت کے میدان میں نصوص کی علت کی تعیین وتفہیم دقیق عمل ہے۔ فقہی کتب میں یہ فن مسالک علت کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے قیاس کے عمل میں علت کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اس کی دریافت کے لیے نقلی واستنباطی طریقہ ہائے کار سے خوب استفادہ کیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے والد شاہ عبدالرحیمؒ فقہ حنفی کے مسلک پر تھے اور انہوں نے فقہ حنفی کے مسائل کا مجموعہ یعنی "فتاویٰ عالمگیری" کی تدوین میں بھی حصہ لیا تھا۔[۵۸] تاہم شاہ صاحبؒ نے خود کو فکری طور پر شافعی اور عملاً حنفی لکھا ہے۔ ڈاکٹر محمد مظہر بقا کے مطابق شاہ صاحبؒ کے فقہی رجحانات وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے شاہ صاحبؒ کے فقہی رجحانات کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱- موروثی رجحانات کا دور ۲- ذاتی غور وفکر کا نتیجہ ۳- حجاز کے قیام کا اثر ۴- برصغیر کے عملی ماحول کے اثرات[۵۹]

شاہ صاحبؒ کی دلی آرزو تھی کہ چاروں مذاہب میں باہم پائے جانے والے تنازعات ہمیشہ کے لیے ختم ہوں۔ آپ نے ان کے باہمی اختلافات مٹانے اور متضاد اقوال میں موافقت پیدا کرنے کے سلسلے میں قابلِ ذکر کردار انجام دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ شافعی اور حنفی فقہ مذاہب کو چونکہ قبولِ عام حاصل ہے اس لیے ان کو ملا کر ایک کر دیا جائے اور طریقہ کار یہ رکھا جائے کہ ان دونوں مسالک میں وہ تمام چیزیں باقی رکھی جائیں جو احادیث کی کتب میں مشترک اور ایک جیسی ہیں۔[۶۰] فروعی مسائل میں شاہ صاحبؒ اس بات کو قبول فرماتے تھے جس پر امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا اتفاق ہوتا تھا۔ البتہ اختلاف کی صورت میں وہ بات اختیار کرتے جو ظاہر حدیث کے موافق ہوتی تھی۔[۶۱] آج جبکہ یونیورسل اور کاسموپولٹین فقہ کے چرچے ہر طرف ہیں اور اس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے یہ بات کرنا بہت آسان ہے لیکن جس پسِ منظر میں شاہ صاحبؒ نے ان فقہی اختلافات کو ختم کر کے ایک متوازن اور حدیث کے معیار پر پوری اترنے والی اجتماعی فقہ کا تصور دیا تھا وہ انتہائی مشکل اور کٹھن دور تھا۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف "[۶۲] میں مسالکِ فقہ میں اختلافات کے اسباب اور ان کے حل کے حوالے سے نہایت عمدہ گفتگو کی ہے۔ فقہ کے میدان میں شاہ صاحبؒ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلکی تعصب اور فقہی جمود کو دور کر کے ذہنوں میں وسعت پیدا کی۔ کیونکہ فقہی مکاتب وجود میں آنے کے بعد معاملہ صرف اتنا ہی نہیں رہا کہ اپنے امام کی پیروی کی جائے بلکہ دوسرے ائمہ کی تنقیص تک جا پہنچا تھا۔ شاہ صاحبؒ کی یہ رائے ہرگز نہیں تھی کہ ائمہ اربعہ کی تقلید سے نکل جائیں[۶۳] مگر وہ علماء دین پر زور دیتے ہیں کہ وہ اجتہادی بصیرت سے کام لیں۔ انہوں نے مختلف فقہی مسالک کے مطالعہ کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس حوالے سے مولانا اختر امام عادل لکھتے ہیں کہ:

> شاہ صاحب کے دور میں جو جمود، تعصب، تنگ نظری اور غالی تصورات پیدا ہو گئے تھے، ان کی بناء پر دیگر مذاہب کے مطالعہ و تحقیق بلکہ احترام کی روایت بھی اٹھتی جارہی تھی ... شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ اس جمود اور تنگ نظری کا سبب مطالعہ و تحقیق اور وسعت نظری کی کمی ہے۔ اگر اہلِ علم تمام مذاہب فقہیہ کا منصفانہ مطالعہ کریں اور ان کے بنیادی مآخذ تک پہنچنے کی کوشش کریں تو مذاہب کے درمیان اس درجہ تفریق وامتیاز کا جو احساس پایا جاتا ہے اس میں کمی آجائے گی اور اسلاف باہم فکری و نظری اختلافات کے باوجود جس رواداری اور اکرام واحترام کا مظاہرہ فرماتے ہیں وہ روایت دوبارہ قائم ہو گی۔[۶۴]

شاہ صاحبؒ نے اپنے دور کی عام روِش سے ہٹ کر فتویٰ بازی کا بازار گرم نہیں کیا۔ ان کے دور میں شیعہ سنی فسادات عروج پر تھے۔ ان پر مستزاد فقہی مسالک کے باہمی تضادات تھے جس نے اجتماعی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی لیکن شاہ صاحبؒ نے اس باب میں انتہائی سنجیدہ کردار ادا کرتے ہوئے سامراجی عزائم کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا۔ شیعہ سنی مسئلہ میں انہوں نے اپنے دور کی افراط و تفریط سے ہٹ کر ایک درمیانی راہ نکالی اور اسے فرقہ واریت کی طرف جانے سے روکا۔ اس حوالے سے انہوں نے خلافت سمیت دیگر اختلافی مسائل میں تطبیق کی راہ نکالی۔ چنانچہ وہ خلافتِ خارجی کے حوالے سے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ اور خلافتِ باطنی کے حوالے سے حضرت علیؓ کو ترجیح دیتے ہیں۔[۶۵] لیکن یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ خلافتِ خارجی کا

درجہ خلافتِ باطنی سے زیادہ ہے۔ البتہ آپ نے اہل تشیع کے نظریہ مہدیت کی تردید کی ہے کیونکہ یہ نظریہ مایوسی پیدا کرتا ہے۔ انہوں نے مختلف مسالک کے فقہی اختلافات اور شیعہ سنی مسئلہ پر اپنے ذاتی رجحانات سے زیادہ اجتماعی مفادات کو ترجیح دی اور وسعتِ نظری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ تشیع کے ساتھ بہت سے معاملات میں اختلاف رائے کے باوجود شاہ صاحبؒ نے کبھی کفر کا فتویٰ نہیں دیا بلکہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے مطابق ایک شخص نے والد ماجد (شاہ ولی اللہؒ) سے شیعوں کے کافر ہونے کے بارے میں فتویٰ دریافت کیا تو والد صاحب نے حنفی فقہاء کا اس باب میں جو اختلاف ہے اس کو بیان فرمادیا۔ وہ شخص جو اہل تشیع کو قطعی کافر سمجھتا تھا اور اس کے جواز کا فتویٰ چاہتا تھا اس کے لیے یہ بات انتہائی ناگوار گزری اور اس نے شاہ صاحبؒ کے شیعہ ہونے کا فتویٰ صادر فرمادیا۔[۶۶] اس واقعہ سے جہاں اس دور کے فکری جمود کا پتہ چلتا ہے وہیں فتویٰ دینے کے حوالے سے شاہ صاحبؒ کی احتیاط اور گہری بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ موجودہ دور کے تناظر میں جبکہ فتویٰ نویسی درحقیقت "فتویٰ گردی" بن چکی ہے شاہ صاحبؒ کے اس طرزِ عمل میں ہمارے لیے بہت کچھ عبرت کا سامان ہے۔

شاہ صاحبؒ کے مسلک کے بارے میں بہت سے لوگوں نے کلام کیا ہے۔ کسی نے ان کو حنفی ثابت کرنے میں پورا زور لگایا تو کسی نے شافعی ثابت کرنے میں۔ مگر یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ اب تک ان کو اپنے دور کے مجدد اور مجتہد کے طور پر نہیں دیکھا گیا جس نے اپنے لیے اپنا راستہ خود منتخب کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد مظہر بقا نے تو اپنی تحقیق میں یہ ثابت کیا ہے کہ انہوں نے شاہ صاحبؒ کو مختلف فیہ مسائل میں تقریباً اسی فیصد احناف کے خلاف پایا ہے جس میں سے ستر فیصد مسائل میں وہ امام شافعی کے ساتھ ہیں۔[۶۷] تاہم صحیح بخاری کے ایک قدیم نسخے پر ان کا خود کا تحریر کردہ نوٹ موجود ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عملاً حنفی تھے لیکن حنفی اور شافعی دونوں فقہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔[۶۸] انہوں نے ان دونوں مسالک میں تطبیق دینے کی کوشش کی۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے شاہ صاحبؒ کے اس عمل کو "عجم و عرب" کے تاریخی تناظر میں اسلام کی بین الاقوامی اجتماعی تحریک سے جوڑا ہے۔[۶۹]

اجتہاد اور تقلید کا موضوع ہر دور میں بڑا نازک اور پیچیدہ رہا ہے۔ شاہ صاحب نے ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ اپنائی ہے۔ چنانچہ اجتہاد کے بارے میں آپ کا نظریہ ہے کہ اجتہاد ہر دور میں فرض کفایہ ہے[۷۰] اور ہر زمانہ میں کم سے کم کسی مجتہد منتسب کا ہونا ضروری ہے۔ وہ تقلید کو مصلحت پر مبنی خیال کرتے ہوئے عام لوگوں کے لیے اس کے جواز کے قائل نظر آتے ہیں۔ لیکن جو شخص اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو اس کے لیے تقلید کو مطلقاً حرام سمجھتے ہیں۔[۷۱] شاہ صاحبؒ کے نزدیک صحت مند انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے اجتہاد و تقلید دونوں کی یکساں طور پر ضرورت ہے۔ انہوں نے اجتہاد و تقلید کے حوالے سے نفس پرستی اور آزادئ فکر کے فرق کو واضح کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ اجتہاد مستقل کو ائمہ مجتہدین پر منقطع ہونے کے قائل ہیں تاہم ان ائمہ اربعہ کے طریق میں رہتے ہوئے اجتہاد کے قائل ہیں جسے وہ اجتہاد مقید یا اجتہاد منتسب کہتے ہیں۔[۷۲] مولانا عبید اللہ سندھیؒ شاہ صاحبؒ کو فقہ حنفی اور فقہ شافعی دونوں فقہ کا مجتہد منتسب مانتے ہیں۔[۷۳] ان کا ماننا ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو مرکزِ اسلام میں تصور کرتے ہیں تو ان دونوں فقہ میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا ضروری سمجھتے ہیں لیکن ہندوستان کے مخصوص حالات میں وہ فقہ حنفی کے مجتہدِ منتسب و مطلق ہوتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ہر قوم کے الگ الگ عادات و خصائل ہوتے ہیں جن سے وہ مانوس ہوتے ہیں۔ اس بنا پر تشریح کے

باب میں ان کی رعایت ضروری ہے تاکہ لوگ آئین سے متوحش نہ ہوں۔ چنانچہ جب کبھی کوئی پیغمبر آیا اس نے اپنی الگ شریعت لوگوں پر نہیں تھوپی بلکہ قوم کے رسم ورواج کا جائزہ لیا اور قانون الٰہی کے مطابق جو چیزیں خیر محض تھیں ان کو علی حالہا قائم رکھا اور جو چیزیں شر محض تھیں ان کو رد کر دیا اور جن چیزوں میں خیر و شر دونوں کا اجتماع وامتزاج تھا ان میں حد وقد کر کے ایسا بنا دیا کہ خیر غالب ہو گیا۔[۴]

شاہ صاحبؒ کے نزدیک چونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسائل میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے اور موجودہ فقہی ذخیرہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے ناکافی ہے اس لیے اجتہادی عمل ناگزیر ہے۔[۵] تاہم وہ اس عمل میں فہم وشعور اور عصری تقاضوں کی گہری بصیرت کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحبؒ اجتہادی عمل میں انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کے اخلاقی، سیاسی، تمدنی، اقتصادی اور معاشرتی پہلوؤں پر بھی بحث کرتے ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۰۸ء-۱۹۸۵ء) نے لکھا ہے کہ: "شاہ صاحب نے ہر حکم کے اسرار ورموز اور اس کے اسباب وعلل پر اس قدر زور دیا ہے کہ اسلام ایک مذہب عقلی ومنطقی ہو گیا ہے۔ اور اس پر جدید مسائل میں اجتہاد کر کے ان کا حکم معلوم کر لینے کا راستہ بہت سہل ہو گیا ہے"۔[۶]

شاہ صاحبؒ نے دینی مسائل کے حل میں غور وتدبر اور مصلحتِ عامہ کی بنیاد پر اجتہادی بصیرت کے جن اصولوں پر زور دیا ہے وہ قابل فہم ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ عمل بھی ہیں۔ اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ شاہ صاحبؒ نے ائمہ ثلاثہ کے برخلاف فقہی اصول "استحسان" کی جو مخالفت کی ہے اور جس میں وہ امام شافعی کے قائل نظر آتے ہیں اس میں اصول سے زیادہ لفظی اختلاف نظر آتا ہے۔ امام شافعی نے جس استحسان کی مخالفت کی تھی وہ "استحسان بالتشہی" ہے اور شاہ صاحبؒ نے بھی اسی استحسان کی مخالفت کی ہے۔ چنانچہ جس استحسان کے احناف قائل ہیں اس سے امام شافعی اور دیگر ائمہ کرام سمیت شاہ صاحبؒ نے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے اور ان کی کتب اس سے بھری پڑی ہیں۔ ڈاکٹر محمد مظہر بقا خود لکھتے ہیں کہ: "جس طرح امام شافعی کی استحسان کی مخالفت کو استحسان بالتشہی کی مخالفت پر محمول کیا گیا ہے، یہی صورت شاہ صاحب کے لیے بھی اختیار کی جا سکتی ہے"۔[۷]

علم تصوف میں تجدیدی مساعی

شاہ صاحبؒ کا دور جاہل صوفیاء اور علماء سوء سے خالی نہ تھا۔ خوشحال خان خٹک جس کا انتقال شاہ صاحب کی پیدائش سے چند سال قبل ہوا تھا اپنے دور کے صوفیاء اور علماء کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> جو کوئی کنز وقدوری پڑھ لیتا ہے وہ ملا بن بیٹھتا ہے، پھر ہر حلال وحرام کو اپنے لیے جائز قرار دے لیتا ہے... ناجائز مال لے کر شریعت کی جڑیں کاٹتے ہیں... مسجد میں آکر پانچ وقت اذان دیتے ہیں لیکن اگر زکوٰۃ وفطرانہ نہ ملے تو مسجد کو ڈھا بھی دیتے ہیں۔ تعویذ دیتے ہیں اور جھوٹ موٹ سب کچھ لکھ دیتے ہیں... صرف کلاہ، پگڑی اور شجرہ دیکھ کر پیری مریدی کی جاتی ہے۔ اگر پیری مریدی یہی ہے تو یہ اس کی بعد اڑانا ہے۔[۸]

شاہ صاحبؒ کے دور میں علماء اور صوفیاء انبیاء کرام کے اسوہ سے ہٹ گئے تھے۔ چنانچہ علماء نے لایعنی اور دوراز کار ابحاث کو اپنی علمیت کا معیار قرار دیا ہوا تھا جبکہ صوفیاء نے کرامات و شعبدہ بازی کو تصوف کی معراج سمجھ رکھا تھا۔ یہ دونوں طبقات دین کے نام پر دنیا پرستی کے فروغ میں پیش پیش تھے۔ شاہ صاحبؒ نے ان دونوں طبقات پر کڑی تنقید کی ہے۔ انہوں نے ان صوفیاء اور علماء کو یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان سے تشبیہ دی اور کہا کہ اگر احبار یہود کی حالت دیکھنا چاہو تو آج کل کے علماء کو دیکھ لو اور اگر عیسائیوں کا نقشہ چاہتے ہو تو آج کے مشائخ اور ان کی اولاد کو دیکھ لو۔[۷۹] شاہ صاحبؒ نے "التفہیمات الالٰہیہ" میں ان غلط کار علماء، نام نہاد صوفیاء اور بے علم مشائخ کی اولاد کو ان کی کوتاہیوں اور غلط روش پر متنبہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "میں دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے پوچھتا ہوں اور واعظوں، عابدوں اور ان کنج نشینوں سے سوال ہے جو خانقاہوں میں بیٹھے ہیں کہ بہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا کیا حال ہے"۔[۸۰]

شاہ صاحبؒ کے اصلاحِ تصوف کی مساعی کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

أ- پہلی قسم میں وہ اصلاحی کوششیں شامل ہیں جن میں تصوف کے مسائل وافکار وغیرہ کو درست کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس کے نظائر وامثلہ درج ذیل ہیں:

- بعض متاخر صوفیاء کے یہاں ایسے اقوال ملتے ہیں جن سے لگتا ہے کہ یہ حضرت انسان کامل کو ملک مقرب پر فضیلت دیتے ہیں۔ لیکن شاہ صاحبؒ نے اس کی تردید کی ہے۔[۸۱]

- شاہ صاحبؒ نے "الولایۃ افضل من النبوۃ" (ولایت نبوت سے افضل ہے) کے عقیدے کا بھی رد کیا ہے۔[۸۲]

- شاہ صاحبؒ نے شیخ کی اندھی تقلید کی بھی مخالفت کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی عارف اپنے کسی مرید سے کہے کہ وہ شراب یا کوئی اور ناجائز چیز خرید لائے تو مرید کو چاہیے کہ اس کے حکم کی تعمیل نہ کرے[۸۳] بلکہ قرآن وسنت کی پیروی کرے۔

- حلول واتحاد کا عقیدہ بھی خالصتاً غیر اسلامی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے دور میں اس عقیدے پر ہونے والی بحثوں پر تنقید کی ہے[۸۴] اور اس عقیدہ کا بھرپور رد کیا ہے۔

- شاہ صاحبؒ نے حد سے تجاوز کرنے والے متقشف قسم کے زاہدوں پر بھی سخت تنقید کی ہے۔[۸۵] اپنی کتب میں انہوں نے تصوف میں شامل ہو جانے والے غلط نظریات اور افراط و تفریط سے بچنے کی تلقین کی ہے۔

- متاخرین صوفیاء کے یہاں ظاہر و باطن کی جامعیت کا جو فقدان ملتا ہے شاہ صاحبؒ نے اسے بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے۔[۸۶] چنانچہ آپؒ تصوف میں ظاہر و باطن دونوں کی تطہیر و تعمیر پر زور دیتے ہیں۔

- شاہ صاحبؒ نے صوفیاء کی دور از کار تاویلات پر بھی بعض مقامات پر دلچسپ پیرائے میں طنز کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی علم نحو کی مشہور کتاب کافیہ ابن حاجب سے تصوف کے قوانین اخذ کرے۔[۸۷] وہ اس عمل کو ناپسند اور غیر شرعی قرار دیتے ہیں۔

ب- دوسری قسم ان اصلاحات پر مبنی ہے جن کا ہدف ان کے معاصر "اہل وغافل صوفیاء" ہیں۔ اس کے نظائر وامثلہ درج ذیل ہیں:

- شاہ صاحبؒ نے مشائخ کی اولادوں کو متنبہ کیا ہے کہ جس اجتماعیت اور روحانیت کی دعوت ان کے آباؤ اجداد دیتے رہے ہیں

وہ بھی ان کے اسوہ پر عمل کریں۔[۸۸]

- وہ صوفیاء کرام کی عام روِش سے ہٹ کر اصلاح معاشرہ، اقامتِ عدل اور خلافت کی تشکیل کا ایک جامع نظام اور منصوبہ مرتب کرتے ہیں۔ ان کا فلسفہ احسان انہیں گوشہ گیری، عافیت کوشی اور انسانوں سے قطع تعلق اور معاشرت سے بے نیازی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ انسانوں کو عادل بنا کر نظام اصلاح وعدل کے قیام پر ابھارتا ہے۔[۸۹]

- شاہ صاحبؒ نے صوفیاء اور مشائخ کو نصیحت کی ہے کہ وہ حجروں میں بیٹھ کر پیری مریدی کرنے اور نذرانے وصول کرنے کی بجائے باعمل زندگی گزاریں۔ حلال روزی کمائیں تاکہ ایک صالح معاشرہ وجود میں آئے جو احیائے دین حق کا باعث بن سکے۔[۹۰]

جس طرح شاہ صاحبؒ مذاہبِ اربعہ میں اجتہادی بصیرت رکھتے تھے اسی طرح سلاسل صوفیاء میں بھی اجتہادی بصیرت رکھتے تھے اور ان میں سے ہر ایک سے استفادہ کے قائل تھے۔ اسی طرح وہ سلاسل صوفیاء میں سے ہر ایک سے مساوی طور پر استفادے کی تلقین کرتے تھے اور اس حوالے سے قرآن وسنت پر ہر ایک کی تعلیمات کو پرکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ: "جس طرح آپ مذاہبِ اربعہ مشہورہ میں سے کسی ایک طریقہ کے پابند نہ تھے۔ بلکہ ہر مذہب وطریق میں جو بات کتاب وسنت کے زیادہ موافق اور انسان کی روحانی اور دنیوی فلاح کے لیے زیادہ مفید دیکھتے اسی کو اختیار کرتے... آپ بیعت کے وقت چاروں خانوادوں (یعنی نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ سلسلوں) کے بزرگوں کے نام لیتے تھے"۔[۹۱]

شاہ صاحبؒ کی روحانی فکر اور نسبت تمام سلاسل کی جامع تھی تاہم اس حوالے سے وہ ہر اس فلسفہ کے مخالف تھے جو ان سلاسل میں داخل کر دیے گئے اور ان کی کوئی اصل قرآن وسنت میں نہیں ملتی۔ اس حوالے سے آپ کی روحانی فکر کی اساس قرآن وسنت پر استوار تھی۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

- چشتیوں کے یہاں ایک نماز ہے جسے "صلوٰۃ معکوس" کہتے ہیں لیکن اس کی تائید قرآن وسنت سے نہیں ہوتی۔ اس لیے شاہ صاحبؒ اس پر سخت تنقید کرتے ہیں۔[۹۲]

- مشائخ قادریہ میں ایک شغل آنے والے احوال کے کشف کا ہے۔ اس میں قرآن کریم کو آگے پیچھے، دائیں اور بائیں ہر سمت میں کھلا رکھنا پڑتا ہے، تاہم شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرا دل اسے گوارا نہیں کرتا، کیونکہ اس میں قرآن کریم کی ایک طرح کی بے ادبی ہے۔[۹۳]

- شاہ صاحبؒ نے سلسلہ نقشبندیہ کے بعض بزرگوں کے ذکر جہری سے انکار کو ہٹ دھرمی بتایا ہے۔[۹۴] اس حوالے سے وہ ذکر جہری کے قائل ہیں۔ انہوں نے نقشبندی صوفیاء کے اس گمان کا بھی رد کیا ہے کہ ان کے سلسلہ میں اوراد وظائف نہیں ہیں۔

شاہ صاحبؒ تصوف کو انسان کی اخلاقی اور روحانی ترقی کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ چار اخلاقی اصولوں کو تصوف کا مدار قرار دیتے ہیں۔

- طہارت: پہلا اصول طہارت کا ہے، جس کی روح یہ ہے کہ باطن منور اور پاکیزہ ہو اور وہ انشراح واطمینان کی دولت سے مالا مال ہو۔ دوسری طرف افکارِ پریشاں اور نظریاتِ ثولیدہ سے دور اور جزع فزع اور فریاد وماتم سے مبرا ہو۔

- اخبات: دوسرا اصول اخبات کا ہے، جو جبروت سے آشنائی پیدا کرتا ہے اور عبادات، اذکار اور تلاوت کے ذریعہ قلب میں

سوز و گداز اور فروتنی و خاکساری کا محرک بنتا ہے۔ اس سے انسان میں خشوع و خضوع کا وصف پیدا ہوتا ہے۔

- سماحت: تیسرا اصول سماحت کا ہے، جس کے دائرے میں زہد و قناعت، جود و سخا، تواضع و فروتنی، امیدوں کی محدودیت، صبر اور لینت و نرم خوئی کی صفات شامل ہیں۔

- عدالت: چوتھا اصول عدالت ہے، اس میں عدلِ اجتماعی، تدبیر منزل، سیاست ملکی اور اصلاحی امور شامل ہیں۔[۹۵]

شاہ صاحبؒ کے دور میں اہلِ تصوف کے ہاں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا مسئلہ بھی اپنے شباب پر تھا۔ وحدت الوجود کا نظریہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (۱۱۶۵ء-۱۲۳۱ء) نے پیش کیا تھا جبکہ اس کے بالمقابل وحدت الشہود کا نظریہ شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴ء-۱۶۲۴ء) نے پیش کیا تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ اسلامی تصوف میں فلسفہ وحدت الشہود کو باقاعدہ طور پر اولاً شیخ احمد سرہندیؒ نے پیش کیا تھا مگر حسی سطح پر اس کا تصور راسخ العقیدہ صوفیاء کے ہاں ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ مولانا سندھیؒ نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے باہمی اختلاف کو آریائی اور سامی مذاہب کے فلسفہ الٰہیات کی تاریخ سے جوڑا ہے۔[۹۶] بہر حال شیخ اکبرؒ کے بعض شارحین ان کے عقیدے کی تشریح کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے "وحدت الوجود عینی" کا مضمون پیدا ہوتا ہے حالانکہ یہ غیر صحیح اور نادرست ہے، کیونکہ شیخ اکبر "وحدت الوجود ظلی" کے قائل تھے۔ اسی طرح شیخ احمد سرہندی بھی اسی کے قائل تھے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ نے ان دونوں کی آراء کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ رائے قائم کی کہ ان دونوں کے مابین کوئی فرق نہیں۔ عبارت کا اختلاف بے معنی ہے اور یہ صرف لفظی نزاع ہے ورنہ دونوں ایک ہی نقطہ پر آکر مل جاتے ہیں۔[۹۷] قاضی جاوید کے مطابق: "اٹھارویں صدی کے برصغیر میں یہ تصور پیش کرنا سہل نہ تھا کیونکہ ابھی صوفیوں کے مختلف گروہوں کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ تاہم ان کی مخالفت کا خدشہ اپنے نصب العین کی صداقت اور عظمت کے احساس تلے دب گیا اور شاہ ولی اللہ نے واضح انداز میں اپنے اس ترکیبی نظریے کی تشہیر کی"۔[۹۸]

حوالہ جات و حواشی

[۱] الازہری، عبد الصمد صارم. سوانح شاہ ولی اللہ. ط: ۱۹۶۷ء، ایم ثناء اللہ خان اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ص ۳

[۲] رحمن علی، مولوی. تذکرہ علمائے ہند. ط: ۱۹۶۱ء، پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی، کراچی، ص ۵۴۴

[۳] ان کا نکاح مولوی نور اللہ بڈھانوی کی دختر سے ہوا تھا لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ۱۷۹۴ء میں انتقال ہوا اور بڈھانہ (ضلع مظفر نگر) دفن ہیں۔

[۴] ان کی شادی شیخ محمد عاشق پھلتی کے صاحبزادے محمد فائق سے ہوئی تھی۔ [تذکرۃ الرشید (حاشیہ)، ط: ۱۴۰۶ھ، مکتبہ مدنیہ، لاہور، ص ۳۰]

[۵] قاسم محمود، سید. اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالم اسلام. ط: ۲۰۱۲ء، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ص ۱۷

[۶] پھلتی، محمد عاشق. القول الجلی. ط: ۱۹۹۰ء، کتب خانہ انوریہ، لکھنؤ، ص ۱۲۱

[۷] شاہ صاحبؒ عام طور پر اپنے مکاشفات میں تاریخ نہیں لکھتے۔ لیکن اس مکاشفہ میں انہوں نے خلاف معمول تاریخ درج کی ہے، جس کے مطابق یہ مکاشفہ ۲۱ ذی قعدہ، ۱۱۴۴ھ میں پیش آیا۔ [فیوض الحرمین، کراچی، ادارہ اسلامیات، ص ۸۹-۹۰، مولانا مناظر احسن گیلانی نے "تذکرہ شاہ ولی اللہ" میں اس مکاشفہ کی اہمیت اور برعظیم کے آئندہ حالات میں اس کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

[۸] فریدی، نسیم احمد، مولانا. نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی. ط ۲۰۱۰ء، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص ۵۹-۶۶

[۹] محمد مظہر بقا، ڈاکٹر. اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ. ط: ۱۹۸۶ء، بقا پبلیکیشنز، کراچی، ص ۱۴۳

[۱۰] دہلوی، رحیم بخش. حیات ولی. ط: ۱۹۵۵ء، المکتبۃ السلفیہ، لاہور، ص ۵۸۰

[۱۱] شاہ صاحبؒ کے نزدیک غلبہ دین کی جدوجہد کے لیے دین کے اساسی اصولوں پر منظم جماعت کا قیام خلافت باطنی کہلاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی مکی زندگی خلافت باطنی کی مثال ہے۔

[۱۲] شاہ صاحبؒ کے نزدیک خلافت باطنی کے نتیجے میں وجود میں آنے والی جماعت کے ذریعے دین کو انسانی سماج میں غالب کرنے کو خلافت ظاہری کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی مدنی زندگی خلافت ظاہری کی مثال ہے۔

[۱۳] محمد اکرام، شیخ. رودِ کوثر. ط: ۲۰۰۹ء، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص ۵۵۱۔ شاہ صاحبؒ کے دور میں اردو زبان شروع ہو چکی تھی۔ اردو کے مشہور شاعر میر درد شاہ صاحبؒ کے ہم عصر اور ان کے فرزندان ارجمند کے استاد بھی تھے۔ وہ شاہ صاحبؒ کی وفات کے ۲۲ سال بعد تک زندہ رہے۔ انگریز سامراج نے جب قومی زبان کو تبدیل کر کے برصغیر کے عوام کو جہالت میں ڈبونے کی کوشش کی تو شاہ صاحبؒ کے فرزندان ارجمند میں سے شاہ عبد القادر دہلویؒ اور شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے اپنی دور بیں نگاہوں سے بھانپ لیا کہ یہ زبان بہت جلد فارسی کی جگہ لے لے گی۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے قرآن کریم کا اردو ترجمہ کیا اور اپنے والد کے "رجوع الی القرآن" کے فکر کو آگے بڑھایا۔

[۱۴] اس کتاب کا کچھ حصہ عربی اور کچھ فارسی میں ہے۔ شاہ صاحبؒ کی بعض دیگر کتب کی طرح اب تک اس کا اردو ترجمہ شائع نہیں ہو سکا۔ اگرچہ کتاب کا کوئی ایک مستقل موضوع نہیں ہے لیکن زیادہ تر اس میں تصوف سے متعلق مسائل بیان ہوئے ہیں۔ اس کے سن تصنیف کے بارے میں کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ بعض حضرات تفہیمات کی ہر تفہیم کو مستقل رسالہ شمار کر کے شاہ صاحب کی تصانیف کو سینکڑوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ جیسا کہ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں کہ "ورسائل تفہیمات وہی تزید مائتین" (اتحاف النبلاء، مطبع نظامی، کانپور، ۱۲۸۸ھ، ص ۴۳)۔ رسالہ مکتوب مدنی اور فضائل بخاری وابن تیمیہ اگرچہ الگ سے بھی شائع ہوئے لیکن اصل میں یہ اس کتاب سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء میں المجمع العلمی ڈھابیل سے دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی اور اس نسخہ کی اساس مدرسہ مظاہر العلوم (سہارنپور) میں محفوظ مولانا یعقوب نانوتویؒ کے قلمی نسخے پر رکھی گئی تھی جس پر سن کتابت ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء درج ہے۔ تاہم اس کا سب سے قدیم قلمی نسخہ رضا لائبریری (رامپور) میں محفوظ ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں لکھا گیا تھا۔

[۱۵] یہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس کا قدیم ترین قلمی نسخہ ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۱/ء کا ہے جو شاہ صاحبؒ ہی کے حکم پر لکھا گیا تھا۔ اس کا ترجمہ غالباً پہلی مرتبہ ۱۲۸۹ھ ۱۸۷۳/ء مطبع نول کشور (لکھنؤ) سے شائع ہوا۔ ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۴/ء یہ دہلی سے مولانا رحیم بخش کے اردو ترجمہ کے ساتھ "اعظم التفسیر" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

[۱۶] اردو زبان میں یہ شاہ صاحبؒ کی سب سے پہلی مکمل سوانح حیات ہے۔ کتاب کے مؤلف دراصل شاہ عبد العزیز دہلویؒ کی سیرت "حیات عزیزی" کے نام سے لکھ رہے تھے مگر بوجوہ یہ کام مکمل نہ کر سکے البتہ یہ کوشش "حیات ولی" کی تالیف پر منتج ہوئی۔ اس کی اولین اشاعت افضل المطابع سے غالباً ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹/ء کے بعد ہوئی تھی۔ بعد ازاں یہ مکتبہ سلفیہ سے ۱۳۷۴ھ ۱۹۵۵/ء بھی شائع ہوئی۔ تاہم کافی عرصہ سے یہ دوبارہ شائع نہیں ہو پائی۔

[۱۷] حیات ولی، ص۴۱۹

[۱۸] قاسمی، سعود عالم، مولانا. شاہ ولی اللہ کی قرآنی فکر کا مطالعہ. ط: ۱۹۹۸ء، المحمود اکیڈمی، لاہور، ص۱۰۲

[۱۹] سندھی، عبید اللہ. شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک. ط: ۲۰۰۸ء، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ص۳۰

[۲۰] ملاحظہ ہو "اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، ص۱۵۲ اور "شاہ ولی اللہ کی قرآنی فکر کا مطالعہ"، ص۱۰۰

[۲۱] دہلوی، شاہ ولی اللہ. مقدمہ فتح الرحمن. ط: ۱۳۰۳ھ، مطبع انصاری، دہلی، ص۲

[۲۲] اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ برصغیر میں قرآن مجید کا پہلا فارسی ترجمہ نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔ چنانچہ اس سے قبل بھی کئی فارسی تراجم کا پتہ چلتا ہے مثلاً ترجمہ مخدوم(۷۸۵ھ ۱۳۸۳/ء)، راز معرفت (۱۰۱۳ھ ۱۶۰۴/ء) اور نعمت عظمیٰ(۱۱۱۴ھ ۱۷۰۳/ء) وغیرہ۔

[۲۳] مقدمہ فتح الرحمن، ص۳

[۲۴] یہ تفسیر شاہ عبد العزیز دہلویؒ نے ۱۲۰۸ھ ۱۷۹۳/ ء میں فارسی زبان میں تحریر کی۔ موجودہ تفسیر سورۃ الفاتحہ سے لیکر دوسرے پارے کے پہلے پاؤ تک اور آخری دو پاروں پر مشتمل ہے۔ بعض محققین (حکیم محمود احمد برکاتی اور ثریاڈار وغیرہ) کا ماننا ہے کہ یہ تفسیر شروع میں مکمل تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران اس کا متعدد حصہ تلف ہو گیا۔ تاہم اس بابت کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ شاہ عبد العزیز کے ایک شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی نے نواب سکندر بیگم (والیہ بھوپال) کی خواہش پر ۲۷ جلدوں میں اس کا تکملہ تحریر کیا تھا جو شائع نہیں ہو سکا۔ اسی طرح مولانا فقیر محمد جہلمی نے بھی اس پر کام کیا تھا جو ۱۰ جلدوں پر مشتمل ہے اور صوفی عبد الحمید سواتیؒ کے کتب خانے میں موجود ہے۔

[۲۵] سید ظہیر الدین دہلویؒ (نواسہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ) نے انفاس العارفین مطبوعہ مطبع احمدی کے اختتام پر "موضح قرآن" کو خاندان ولی اللہی سے منسوب جعلی تفسیر قرار دیا ہے۔ لیکن متعدد علماء کا اس پر اجماع ہے کہ یہ تفسیر شاہ عبد القادر دہلویؒ ہی کی تحریر کردہ ہے۔ نامعلوم سید ظہیر الدین دہلویؒ نے کس بناء پر بلا دلیل یہ دعویٰ کیا ہے۔

[۲۶] سندھی، عبید اللہ، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص۳۲

[۲۷] سندھی، عبید اللہ. مولانا، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ. ط: ۲۰۰۲ء، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ص۶۰

[۲۸] اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحبؒ کی اس مختصر فارسی کتاب کو سب سے زیادہ شہرت دی تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ کتاب کئی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اردو میں بھی اس کے متعدد تراجم ہو چکے ہیں جن میں سے آٹھ تو راقم کے پاس موجود ہیں۔ ہندوستان میں خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں اس کتاب کے دو اور رضا لائبریری (رام پور) میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جبکہ پاکستان میں اس کے چار نسخے دو کتب خانہ ہمدرد (کراچی)، اور ایک ایک حسب ترتیب کتب خانہ مہریہ (گولڑہ شریف) اور کتب خانہ اسلامیہ کالج (پشاور) میں موجود ہے۔

[۲۹] دہلوی، شاہ ولی اللہ. الفوز الکبیر فی اصول التفسیر. ط: ۱۸۹۸ء، مطبع مجتبائی، دہلی، ص۴۶

[۳۰] جن پانچ آیات کو شاہ صاحب نے "الفوز الکبیر" میں منسوخ تسلیم کیا ہے انہی کو "فتح الرحمن" میں بھی منسوخ مانا ہے۔ لیکن "الفوز الکبیر" میں سورۃ الاحزاب کی آیت "لایحل لک النساء من بعد" (الاحزاب:۵۲) کو منسوخ اور اسی سورۃ کی آیت "انا احللنا لک

ازواجک الٰتی آتیت اجورھن"(الاحزاب:۵۰) کو ناسخ قرار دیا ہے جبکہ "فتح الرحمن" میں اس کے برعکس کیا ہے۔ چونکہ "الفوز الکبیر" بعد کی تصنیف ہے اس لیے اس کا بیان ہی درست سمجھا جائے گا۔

[۳۱] اس رسالہ کو شاہ صاحبؒ نے اگرچہ مستقل رسالہ کی شکل بھی دی ہے اور یہ مستقلاً شائع بھی ہوا ہے لیکن خود شاہ صاحبؒ کی تصریح کے مطابق دراصل یہ "الفوز الکبیر" کا باب پنجم ہے۔ اس رسالہ میں مصنف نے قرآن مجید کے غرائب کی شرح فرمائی ہے۔ یہ رسالہ پہلی مرتبہ ۱۳۱۴ھ ۱۸۹۶/ء مطبع نول کشور (لکھنؤ) سے شائع ہوا تھا۔

[۳۲] یہ اس مقدمہ سے مختلف ہے جو "فتح الرحمن" مطبوعہ میرٹھ کے شروع میں ہے۔ اس کے سن تصنیف کے بارے میں صراحت سے کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ بعض شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۱۴۲ھ / ۱۷۳۰ء سے ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۹ء کے درمیان لکھا گیا۔ اس مختصر رسالے کی زبان فارسی ہے تاہم اس کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی (۱۹۰۱ء-۱۹۶۳ء) نے کیا تھا جو برہان دہلی (شمارہ ۴-۵ اکتوبر و نومبر ۱۹۴۵ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے اردو ترجمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سیوہاروی کو کوئی صحیح نسخہ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس لیے اصل میں اغلاط کی وجہ سے ترجمہ میں بھی بہت سی اغلاط در آئی ہیں۔ ہندوستان میں اس کے قلمی نسخے دار العلوم (دیوبند) اور خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں جبکہ پاکستان میں اس کے قلمی نسخے مدرسۃ الاسلام لاڑکانہ (سندھ)، مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ (کراچی) اور مکتبہ شرقیہ دار العلوم (پشاور) میں محفوظ ہیں۔

[۳۳] اس کتاب کا سن تصنیف ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۹ء ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ سید ظہیر الدین دہلویؒ کی کوشش سے مطبع احمدی دہلی سے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کو اس کتاب کا ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۶ء کا لکھا ہوا محمد نوشہ (شاگرد شاہ عبد العزیز دہلویؒ) کا ایک قدیم قلمی نسخہ ہاتھ آیا اور انہوں نے قلمی و مطبوعہ ہر دو نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کتاب کو ایڈٹ کیا اور یہ کتاب شاہ ولی اللہ اکیڈمی (حیدر آباد) سے شائع ہوئی۔

[۳۴] دہلوی، شاہ ولی اللہ. التفہیمات الالٰہیہ. ط: ۱۹۹۷ء، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، ۲/ ۲۰۰

[۳۵] سندھی، عبید اللہ. افادات وملفوظات. مرتب: پروفیسر محمد سرور. ط: ۲۰۰۵ء، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ص۲۶۸

[۳۶] ہالے پوتہ، عبد الواحد، ڈاکٹر. شاہ ولی اللہ کا فلسفہ. مترجم: پروفیسر محمد سعید. ط: ۱۹۷۴ء، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، ۱/ ۱۷۵

[۳۷] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص۴۶-۴۸

[۳۸] جعفری، عبد القادر، "شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی خدمات"، سہ ماہی اسلام اور عصر جدید، دہلی، شمارہ ۳-۴، جلد ۴۲، ص۱۸۹

[۳۹] قاسمی، عطاء الرحمن (مرتب). امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات (مجموعہ مقالات). ط: ۲۰۰۵ء، مکتبۃ الخلیل، لاہور، ص۲۱۰

[۴۰] ندوی، ابو الحسن علی. تاریخ دعوت وعزیمت. ط: مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۵/ ۱۸۹

[۴۱] جلبانی، غلام حسین، پروفیسر. شاہ ولی اللہ کی تعلیم. ط: ۲۰۰۲ء، دار الکتاب، لاہور، ص۵۹

[۴۲] دہلوی، شاہ ولی اللہ. حجۃ اللہ البالغہ. ط: قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱/۱

[۴۳] اس کتاب کا سن تصنیف ۱۱۴۸ھ / ۱۷۳۶ء سے قبل کا ہے۔ اس کتاب کے کل چھ قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) مکتوبہ ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء۔ نسخہ خالد اسحاق (کراچی) مکتوبہ ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء۔ نسخہ پیر جھنڈا (حیدر آباد) مکتوبہ ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ء۔ نسخہ کاکوری (لکھنؤ) مکتوبہ ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء۔ نسخہ برلین (جرمنی) بلا سن کتابت۔ نسخہ مدرسہ

صولتیہ (مکہ معظمہ) بلا سن کتابت۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء میں مولانا احسن نانوتوی صدیقیؒ کی تصحیح و تعلیق کے ساتھ مطبع صدیقی (بریلی) سے شائع ہوئی تھی۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے انگریزی، فرانسیسی، جاپانی، بنگالی اور اردو میں تراجم ہو چکے ہیں۔

[۴۴] دہلوی، شاہ عبد العزیز، ملفوظات عزیزیہ، ص ۱۹۳

[۴۵] عبد اللہ، محمد. شاہ ولی اللہ کے معاشی نظریات کا تحقیقی مطالعہ (مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی). ط: ۲۰۰۵ء، کلیہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی، ص ۴۱

[۴۶] اس سلسلے میں شاہ صاحبؒ نے "شرح تراجم ابواب صحیح بخاری" سن ۱۱۴۶ھ / ۱۷۳۴ء میں تالیف فرمایا۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ لیکن سب سے صحیح نسخہ دائرۃ المعارف عثمانیہ (حیدر آباد) کا ہے جو ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔ شاہ صاحبؒ کے اس مختصر رسالے پر شیخ عزت محمد فرغلی نے ۴۷۱ صفحات پر "شرح تراجم ابواب البخاری" کے نام سے تحقیقی کام کیا ہے جو ۱۴۲۰ھ / ۱۹۹۹ء میں دار الکتاب المصری (قاہرہ) سے شائع ہوا ہے۔

[۴۷] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص ۱۲۳

[۴۸] دہلوی، شاہ ولی اللہ. المصفیٰ شرح مؤطا. ط: مطبع فاروقی، دہلی، ص ۲

[۴۹] تفصیل ملاحظہ ہو مقدمہ "المصفیٰ شرح مؤطا

[۵۰] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص ۱۳۹

[۵۱] یہ عربی زبان میں مؤطا کی شرح ہے۔ سن تالیف کے بارے میں گمان یہ ہے کہ یہ ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۳ء کے آس پاس لکھا گیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری (رامپور) اور ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں موجود ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں مطبع فاروقی (دہلی) سے "المصفیٰ" کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ کتب خانہ رحیمیہ (دہلی) سے ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۷ء میں دوسری مرتبہ شائع ہوئی۔ تیسری مرتبہ مطبع سلفیہ (مکہ مکرمہ) سے ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔

[۵۲] یہ فارسی زبان میں مؤطا کی شرح ہے۔ سن تالیف ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۳ء کے قریب کا ہے۔ اس کا سب سے مستند قلمی نسخہ دار العلوم (دیو بند) میں موجود ہے۔ اس نسخہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس پر شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے دستخط موجود ہیں نیز شاہ محمد عاشق پھلتی کی تسوید و تبییض بھی شامل ہے جو آج تک مکمل شائع نہیں ہوئی۔ اسی طرح اس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں بھی موجود ہے جو ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں مطبع فاروقی (دہلی) سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ حال ہی میں سید سلمان ندوی (فرزند سید سلیمان ندویؒ) نے اسے عربی زبان میں منتقل کیا ہے۔ راقم اس کے اردو ترجمہ کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

[۵۳] حجۃ اللہ البالغہ، ۱/ ۴۶۵

[۵۴] ابن ماجہ، محمد بن یزید. سنن ابن ماجہ. دار احیاء الکتب العربیہ، مصر، ۱/ ۲۲

[۵۵] حجۃ اللہ البالغہ، ۱/ ۴۶۶

[۵۶] امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات، ص ۴۴

[۵۷] ایضاً، ص ۴۴-۴۵

[58] دہلوی، شاہ ولی اللہ. انفاس العارفین. ط: مطبع مجتبائی، دہلی، ص ۲۴

[59] اصولِ فقہ اور شاہ ولی اللہ، ص ۸۹-۹۶

[60] التفہیمات الالٰہیہ، ۱/ ۲۱۱

[61] ایضاً، ۱/ ۲۰۲

[62] یہ کتاب دراصل "حجۃ اللہ البالغہ" کی پہلی جلد کے آخر میں درج ہے لیکن شاہ صاحبؒ نے اسے الگ کتاب کے طور پر بھی بیان کیا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں اس کا نام "غایۃ الانصاف" لکھا گیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری (رامپور) میں مکتوبہ ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء محفوظ ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء میں بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔

[63] چنانچہ اپنے ایک مشاہدے کے مطابق فرماتے ہیں کہ مجھے وصیت کی گئی ہے کہ مذاہب اربعہ کا اپنے آپ کو پابند رکھوں (فیوض الحرمین، ص ۲۲۷)

[64] امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات، ص ۳۴۹

[65] جاوید، قاضی. افکار شاہ ولی اللہ. ط: ۲۰۰۶ء، فکشن ہاؤس، لاہور، ص ۱۲۴

[66] گیلانی، مناظر احسن. تذکرہ شاہ ولی اللہ. ط: ۲۰۰۳ء، نوید پبلشرز، لاہور، ص ۱۳۷-۱۳۸

[67] اصولِ فقہ اور شاہ ولی اللہ، ص ۶۰۲

[68] یہ نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں محفوظ ہے اور شاہ صاحبؒ کے درس میں رہا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس نسخے پر اپنے ہاتھ سے اپنی سند امام بخاری تک تحریر کی ہے اور اس پر تاریخ ۲۳ شوال ۱۱۵۹ھ ۱۷۴۷/ء کی درج ہے۔ اس تحریر کے نیچے شاہ رفیع الدین کی توثیق ہے کہ یہ عبارت ان کے والد کے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔

[69] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص ۱۷۶

[70] فیوض الحرمین، ص ۶۲

[71] حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۴۴

[72] دہلوی، شاہ ولی اللہ. الانصاف فی بیان سبب الاختلاف. ط: ۲۰۱۳ء، دارالکتب، پشاور، ص ۴۸

[73] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص ۱۸۶

[74] حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۹۴

[75] مصفّٰی شرح مؤطا، ص ۲۰

[76] اکبر آبادی، سعید احمد، "شاہ ولی اللہ کا نظریہ اجتہاد"، ماہنامہ الولی، حیدر آباد، ج ۱۷، شمارہ ۲-۳، ص ۱۹

[77] اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، ص ۵۰۹

[78] قدوسی، اعجاز الحق. تذکرہ صوفیاءِ سرحد. ط: ۱۹۶۶ء، مرکزی اردو بورڈ، کراچی، ص ۳۶۴

[79] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۴۰-۴۴

[80] التفہیمات الالٰہیہ، ج ۱، ص ۲۸۲

[۸۱] ایضاً، ج ۲، ص ۵۱

[۸۲] اَیضا

[۸۳] ایضاً، ج ۲، ص ۵۴

[۸۴] ایضاً، ج ۲، ص ۶۰۲

[۸۵] دہلوی، شاہ ولی اللہ. الطاف القدس. ط: ۱۹۹۳ء، ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ، ص ۷۰

[۸۶] ایضاً، ص ۷۲

[۸۷] دہلوی، شاہ ولی اللہ. ہمعات. مترجم: پرفیسر محمد سرور. ط: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ص ۶

[۸۸] التفہیمات الالٰہیہ، ۱/ ۲۸۴

[۸۹] فلاحی، عبید اللہ فہد، ڈاکٹر. اسلامی عمرانیات: شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار کا مطالعہ. ط: ۲۰۱۱ء، القلم پبلی کیشنز، کشمیر، ص ۱۹۲

[۹۰] اختر، احسان الحق. حضرت شاہ ولی اللہ. ط: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۶۷

[۹۱] رودِ کوثر، ص ۵۶۶

[۹۲] دہلوی، شاہ ولی اللہ. القول الجمیل. مترجم: پروفیسر محمد سرور. ط: ۲۰۰۳ء، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ص ۷۲

[۹۳] ایضاً، ص ۴۶

[۹۴] ہمعات، ص ۷۶

[۹۵] الطاف القدس، ص ۵۲-۵۳، نیز اسلامی عمرانیات، ص ۱۹۴-۱۹۵

[۹۶] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص ۱۹۸-۱۹۹

[۹۷] دہلوی، شاہ ولی اللہ. مکتوبِ مدنی. ط: ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص ۱۹

[۹۸] افکار شاہ ولی اللہ، ص ۱۱۵